مشیر الحق

علم کلام اور شریعت کی نئ تعبیر

کیا شریعت کی نئ تعبیر کلامی مباحث کے چھیڑے بغیر ممکن ہے؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اپنے ذہن میں علم کلام اور شریعت کے مفہوم کو متعین کر لیں۔

علم کلام میں عام طور سے مابعد الطبیعاتی مسائل سے بحث کی جاتی ہے اور شریعت ان قرآنی قوانین کا نام ہے، جنھیں فقہائے کرام نے سنت نبوی قیاس اور اجماع کی بنیاد پر مرتب کیا ہے اور جن کا تعلق اخروی زندگی کے علاوہ بہت حد تک براہ راست ہماری موجودہ زندگی سے ہے۔ اس طرح بظاہر علم کلام اور شریعت کے دائرہ کار بالکل الگ الگ ہو جاتے ہیں ۔ اس نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو شریعت کی کسی نئ تعبیر کے لیے کلام کی قطعاً" کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ لیکن کیا یہ مفروضہ صحیح بھی ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ میرے خیال میں شریعت کی نئ تعبیر کے لیے کلامی مباحث کے دلدل میں اترے بغیر چارہ نہیں ہے۔

ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ ابتدائے آفرینش سے انسانوں کی ہدایت کے لیے وقتاً" فوقتاً" انبیا کو بھیجتا رہا ہے اور ان کے ذریعے اپنا پیغام لوگوں تک پہنچاتا رہا ہے۔ تاریخی حیثیت سے رسالت کا یہ سلسلہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے۔ یوں ہمارے عقیدے کے مطابق اللہ تعالیٰ نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اپنا مکمل پیغام قرآن کی شکل میں انسانوں کے حوالے کر دیا۔ اب نہ تو کوئی رسول آئے گا اور نہ کوئی الہامی

کتاب انسانیت کو دی جائے گی۔ اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم قرآن کو قیامت تک کے لیے ہر ملک و ملت کے واسطے آخری کتاب ہدایت تسلیم کریں۔ اگر کوئی شخص یہ عقیدہ نہیں رکھتا تو ہم اسے مسلمان نہیں کہہ سکتے۔ علمی طور سے اگر دیکھا جائے تو درحقیقت اسی عقیدہ نے فقہ کے ان اصولوں کو جنم دیا ہے، جن کی بنیاد پر قرآنی آیات سے ماضی میں مختلف قوانین کا استنباط کیا گیا ہے، اور اسی عقیدے نے قرآن کو دوامی حیثیت بھی دی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت اس کا علام الغیوب ہونا ہے۔ ازل سے لے کر ابد تک، ہر قسم کے پیش آنے والے واقعات کا اسے علم تھا، اور ہے۔ قرآن اسی علم کا آئینہ دار ہے۔ چوں کہ اب کوئی دوسرا قرآن نہیں آئے گا، اس لیے ہمیں ہدایت کی گئی ہے کہ جب بھی کوئی مسئلہ ہمارے سامنے آئے تو اس کا حل ہم قرآن میں تلاش کریں۔ یہ تلاش کس طرح کی جائے گی، اس کا سبق ہمیں معاذ بن جبلؓ کی اس روایت کے ذریعے سکھایا گیا ہے۔ جس میں سنت نبوی علیہ الصلوۃ والسلام اور قاضی کی اپنی فہم و بصیرت کے سہارے وحی کے مفہوم کو متعین کرنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ (۱)

جس وقت ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن کی حیثیت دوامی ہے، تو ہمیں یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ ہم دراصل کس بات کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ بظاہر سننے میں یہ جو ایک معمولی سا جملہ ہے۔ حقیقت اپنے اندر ایک پوری کلامی دنیا چھپائے ہوئے ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ "دوامی" کیا چیز ہے۔ وحی کا وہ مفہوم جو خدا کے علم میں ہے۔ یا اس کا وہ مطلب جسے فہم انسانی نے اخذ کیا ہے؟ وحی کی انسانی تشریح کو اگر ہم دوامی تسلیم کر لیں تو پھر لامحالہ ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انسان اللہ تعالے کے علم کا مکمل ادراک کر سکتا ہے، حالانکہ ایسا ممکن نہیں ہے، کیوں کہ مکمل ادراک کے لیے اور کچھ نہیں تو کم از کم علم غیب پر پوری دست رس ضروری ہے اور جس کے بارے میں قرآن کا بھی ارشاد ہے

اور علما کا بھی اتفاق ہے کہ انسان کو علم غیب حاصل نہیں ہے۔ ایسی صورت میں ہم یہ دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں کہ سنت' قیاس اور اجماع کے سہاوے علمائے اسلام نے وحی الٰہی کی جو تشریح ماضی میں کی ہے یا مستقبل میں کریں گے' وہ علم خداوندی کی مکمل عکاس ہو گی۔ اس بات کی وضاحت کے لیے ہم قرآن کا کوئی سا حکم بھی بطور مثال کے لے سکتے ہیں۔ مثلاً" چوری کے بارے میں وحی کو لیجیے۔ قرآن میں صرف چور کے قطع ید کا ذکر ہے' لیکن اس چھوٹی سی آیت کو سامنے رکھ کر فقہا نے بے شمار احکام کا استنباط کیا ہے جو تمام کے تمام شریعت کا جزو کہلاتے ہیں۔ چور کسے کہیں گے' چوری کی تعریف کیا ہے' کن حالات میں سزا کا نفاذ ہو گا' کب نہیں ہو گا؟ یہ تمام مسائل درحقیقت علم خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش کا نتیجہ ہیں۔ اب اس صورت میں دوامی کسے کہا جائے گا قرآنی آیت' السارق والسارقتہ فاقطعوا ایدیھما(چور اور چورنی کے ہاتھوں کو کاٹ دو) کے اس مفہوم کو جو نزول وحی کے وقت خدا کے علم میں تھا' یا ان تمام شرعی قوانین کو جنھیں اس آیت کی روشنی میں مستنبط کیا گیا ہے!

جہاں تک آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک کا تعلق ہے' یہ کہا جا سکتا ہے۔ آپ کی بارے میں علم غیب کا مسئلہ بہت حد تک مختلف فیہ ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جن کا ایمان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب حاصل تھا۔ ان کے نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ وحی کی تشریح جس حد تک براہ راست آپؐ کی طرف سے منسوب ہے' اسے دو علم کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی تصویر کا صرف ایک ہی رخ ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب سے متصف ماننے والے لوگ بھی صرف اس بات کا دعوے کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں وحی کا جو ہمہ جہتی اور کل زمانی مفہوم ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے پوری طرح واقف تھی لیکن بذات خود واقف ہوتا اور اس علم کو عام کر دینا دو بالکل الگ چیزیں

ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم غیب سے یہ نتیجہ تو بہرصورت نہیں نکالا جا سکتا کہ آپ کی طرف وحی خداوندی کی جو تشریحیں منسوب ہیں' وہ وقتی ضروریات کے تحت نہ تھیں' بلکہ آئندہ پیش آنے والی واقعات کو سامنے رکھ کر آپ نے وہ تشریحیں کی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح و تعبیر خود اپنی ذات کے لیے نہیں ہو سکتا آپ کے اردگرد جو لوگ تھے' ان کے لیے ان کی قوت فہم وادراک کو سامنے رکھتے ہوئے کرتے تھے۔ اگر آپ ایسا نہ کرتے تو آپ کی تشریحات آپ کے ہم عصروں کے لیے بے معنی ہو کر رہ جاتیں۔ اس سلسلے میں ہمیں آپ کے ارشاد ------" گفتگو مخاطب کی فہم کے مطابق کرنی چاہیے" ------ کو ذہن میں ضرور رکھنا چاہیے۔ ہمیں اس مشہور واقعہ کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ایک بار آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک باغ میں چند صحابہؓ کے ساتھ تشریف رکھتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ نے فرمایا کہ جس نے بھی اللہ کی وحدانیت کا اقرار کر لیا' جنت اس کے لیے مقدر ہو گئی۔ ایک صحابی آپؐ کے اس فرمان کو لے کر دوسروں تک پہنچانے کے لیے چل پڑے۔ باغ کے دروازے پر حضرت عمرؓ سے ان کی ملاقات ہوئی۔ جب حضرت عمرؓ کو اس ارشاد کا علم ہوا تو وہ ان صحابی کو اپنے ساتھ واپس لیتے آئے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اگر آپ کا یہ حکم عوام تک پہنچ جائے گا تو لوگ "بے عمل" ہو جائیں گے' اس لیے اس حکم کو عام کر دینا مصلحت کے خلاف ہے' آں حضرت نے اس مشورہ کو قبول کر لیا اور حکم عام ہونے سے رہ گیا' یہ اور اسی قسم کے دوسرے واقعات اس کی بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم وحی الٰہی کی تشریح و تعبیر کرتے وقت مصالح امت کو ذہن میں ضرور رکھتے تھے۔ کیونکہ اگر آپ ایسا نہ کرتے تو آپ کی تشریحات آپ کے ہم عصرون کے لیے بے معنی ہو کر رہ جاتیں۔ اس لیے اگر موجودہ تشریحات نبوی کو دوام کا درجہ

دے دیا جائے تو پھر ہمیں لامحالہ یہ کہنا پڑے گا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو علم غیب تھا ہی آپ کے صحابہؓ کو بھی پورا نہیں، تو کم از کم اتنا علم غیب ضرور حاصل تھا کہ ان کے سامنے ایک ایسی بات کہی جا رہی تھی جو ان کے علم و فہم کے مطابق زمان و مکاں سے ماورا تھی، پھر بھی وہ اسے سمجھ رہے تھے۔ یا پھر ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ حالات اور زمانے میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وحی کو بذات خود تو دوام کا درجہ حاصل ہے، لیکن جہاں تک اس کے مفہوم کی تعیین کا سوال ہے وہ تغیر پذیر حالات و کیفیات کے تابع ہے، اور قرآن کے مفہوم کو تغیر پذیر تسلیم کرنے کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ منصوصات قرآنی میں بھی اجتہاد کے امکان پر غور و خوض کی ابتداء ہو جائے گی۔

کہا یہ جاتا ہے کہ منصوصات میں اجتہاد نہیں ہو سکتا۔ لیکن مذکورہ بالا بحث کی روشنی میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "نص" ہے کیا چیز! نص آیا نفس حکم ہے یا تعبیر حکم! مثلاً" وراثت کے مسئلے کو لیجیے۔ چونکہ قرآن میں الگ الگ تفصیل سے مختلف حصے داروں کے حصے متعین کر دیے گئے ہیں، اس لیے کہا جاتا ہے کہ زمانے کے تقاضے خواہ کچھ بھی ہوں، ان حصوں کی متعینہ نسبت میں کسی قسم کا ردو بدل نہیں کیا جا سکتا۔ سماجی، معاشی سیاسی حالات خواہ کچھ بھی ہو جائیں، لیکن وراثت کے حصے چونکہ منصوص ہیں، اس لیے مرد کو بہر صورت عورت سے دو گنا حصہ دیا جائے گا۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ چوں کہ انسان اللہ تعالیٰ کے علم کا پوری طرح سے احاطہ نہیں کر سکتا، اس لیے ہم کس طرح یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ میراث کے احکامات کا جو مطلب ہم ابھی تک سمجھتے رہے ہیں، وہی آخری مطلب ہے۔ کیا اس کا امکان نہیں ہے کہ اگر حالات تبدیل ہو جائیں اور قرائن کسی ایسے دوسرے مفہوم کی طرف اشارہ کریں جو روح اسلام کے خلاف نہ ہو تو پہلے مفہوم پر نظر ثانی کی جائے۔

یہ ایک پرانی بحث ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی کوئی علت یا مصلحت ہوتی ہے یا وہ بلاسبب ہوتے ہیں۔ عام طور سے کہا یہی جاتا ہے کہ قرآن کا کوئی حکم مصلحت اور علت سے خالی نہیں ہے۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام باتوں کی علت اور مصلحت ہم پر پہلے دن سے ظاہر ہو' لیکن نفس مصلحت کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس وضاحت کے بعد ہم نفس مسئلہ کی طرف آتے ہیں۔

میراث کے کچھ حصوں کا ذکر تو سورۃ نساء آیت نمبر۱۱ میں ہے اور کچھ کا سورت کی بالکل آخری آیت ۷۶ میں۔ ان دونوں جگہوں پر مردوں کو عورتوں سے دوگنا حصہ دیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اختلاف جنس کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے میراث کے حصوں میں فرق کیوں کیا ہے' نیز یہ کہ فرق دائمی ہے یا کسی علت کا تابع ہے؟ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے ہمیں اس فرق کی علت کو تلاش کرنا ہو گا سورۃ النساء ہی کی آیت نمبر۳۴ میں مردوں اور عورتوں کے فرق کو یوں ظاہر کیا گیا ہے۔

الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللّٰہ بعضھم علی بعض و بما انفقو من موالھم۔

مرد حاکم ہیں عورتوں پر' اس واسطے کہ بڑائی دی اللہ نے ایک کو ایک پر اور اس واسطے کہ خرچ کیے انھوں نے اپنے مال۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

شیخ الہند کے اس ترجمے کی تشریح مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کے الفاظ میں یوں ہے۔ ”خلاصہ یہ ہے کہ مردوں کو عورتوں پر اللہ تعالیٰ نے حاکم اور نگران حال بنایا دو وجہ سے۔

اول بڑی اور وہبی وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اصل سے بعضوں پر یعنی مردوں کو عورتوں پر علم و عمل میں کہ جن دونوں پر تمام کمالات کا مدار ہے' فضیلت اور بڑائی عطا فرمائی ہے' جس کی تشریح احادیث میں موجود ہے۔

دوسری وجہ جو کسبی ہے یہ ہے کہ مرد عورتوں پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں اور مہر اور خوراک اور پوشاک جملہ ضروریات کا تکفل کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو مردوں کی حکم برداری کرنی چاہیے"۔

اس تشریح کی روشنی میں عورتوں پر مردوں کی فضیلت کے اسباب دو قسم کے ہیں۔ ایک وہبی ہے جو خالصتاً" اللہ کی مرضی پر منحصر ہے۔ اور دوسرا کسبی ہے جس کا تعلق خود انسان کی ذات سے ہے۔ اس آیت میں کسبی سبب حصول مال ہے جسے مرد اپنے زور بازو سے اپنے اہل و عیال کے لیے کماتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ان میں سے کوئی بھی سبب نتیجہ" دائمی نہیں ہے۔ انسان یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہ سکتا کہ اللہ تعالیٰ کب کسے کس کے اوپر فضیلت دے دے۔ اسی طرح کوئی سبب بھی حالات کے تحت بدل سکتا ہے۔ بہر حال " قوامیت" کی اس آیت کی روشنی میں اگر ہم میراث کی آیات کو دیکھیں تو مردوں اور عورتوں کے حصوں میں فرق کا بظاہر ایک سبب یہ معلوم ہو گا کہ مردون پر چوں کہ گھر کے چلانے کی ذمے داری ہوتی ہے' اس لیے تقاضائے انصاف یہ تھا کہ انھیں زیادہ حصہ دیا جاتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ میراث کے مبینہ حصوں کی دوامیت اس وقت تک ضروری ہے جب تک معاشرہ کا عمومی ڈھانچہ اس قسم کا ہو جس میں گھر چلانے کی قانونی ذمہ داری مردوں کے سر ہو۔ اگر کبھی ایسا وقت آ جائے جب معاش کے ذمے داری اصولی طور سے مرد اور عورت دونوں کے سر ہو جائے تو اس وقت حکم کا مفہوم بھی بدل جائے گا۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کبھی اس دنیا کا سماجی ڈھانچہ اس قسم کا بن جائے جس میں گھر چلانے کی ذمے داری قانونی طور پر عورتوں کے سر آ جائے' اس وقت عورتوں کو مردوں سے دوگنا حصہ ملا کرے گا' اس سے بحث نہیں کہ آج وہ وقت آ گیا ہے یا نہیں' یا کبھی ایسا وقت آ بھی سکتا ہی یا نہیں' یہ عین ممکن ہے کہ دلائل و شواہد اور

اعداد و شمار سے یہ ثابت کر دیا جائے کہ آج بھی عورتوں کی تمام آزادی اور حقوق کے باوجود قانونی طور سے گھر چلانے کی ذمہ داری صرف مردوں ہی کے سر ہے، اس لیے تبدیلی کی بات کرنا غلط ہے۔ لیکن سوال تبدیلی لانے یا نہ لانے کا نہیں ہے بلکہ اس اصول کا ہے کہ اگر کبھی بھی عورت کو جائز طریقے سے قوامیت کا درجہ مل گیا یا قوامیت کے بجائے مساوات قائم ہو گئی تو میراث کے قوانین پر نظر ثانی کی جا سکتی ہے یا نہیں۔ بعض لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں صرف اپنے نظریے کی تائید میں قرآن کی ایسی دو آیتوں کو ملا کر پڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں جن کے درمیان ۲۰۔ ۲۵ آیات کا فصل ہے۔ لیکن میرے خیال میں ان دونوں آیات کے درمیان ظاہری فصل کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے کیونکہ ترتیب آیات کے سلسلے میں ہم یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ کسی آیت کو زمانہ نزول کا لحاظ کیے بغیر اس کی متعین جگہ پر اللہ تعالیٰ نے کسی خاص مصلحت سے رکھوایا ہے۔ ہمیں تو صرف اتنا معلوم ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی وحی آتی تھی، اس وقت آپؐ کو یہ بھی بتا دیا جاتا تھا کہ اسے فلاں مقام پر جگہ ملنی چاہیے۔ اس لیے کوئی شخص بھی اللہ تعالیٰ کے علم کا مکمل ادراک کیے بغیر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ "قوامیت" قانون میراث کی علت نہیں ہے۔ ان دونوں آیتوں میں ربط معنوی کا ایک دوسرا ثبوت یہ بھی ہے کہ خود میراث کی تمام آیتیں یک جا مذکور نہیں ہیں۔ کچھ آیتیں تو شروع سورت میں ہیں، پھر ۲۰، ۲۵ آیتوں کے بعد قوامیت کی آیت آتی ہے، اس کے بعد ختم سورت پر آیت نمبر ۱۷۶ میں "کلالہ" کے ذیل میں دوبارہ میراث کے کچھ احکامات بیان کیے گئے ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ خود میراث کے احکام کو اللہ تعالیٰ نے اگر کسی مصلحت سے تین الگ الگ جگہوں پر بیان کیا ہے تو وہ مرد اور عورت کے حصوں میں فرق کے سبب کو بھی الگ بیان کر سکتا ہے۔

حالات کے تحت نصوص میں تبدیلی کے امکانات کے سلسلے میں اب ہم ایک دوسری مثال لیتے ہیں۔ قرض کے لین دین کے سلسلے میں قرآن کا حکم ہے کہ اس کی باقاعدہ لکھا پڑھی ہونی چاہیے۔ پھر تحریر مکمل ہو جانے کے بعد۔

"گواہ کرو دو شاہد اپنے مردوں میں سے۔ پھر اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے کہ جن کو تم پسند کرتے ہو گواہوں میں۔ تاکہ اگر بھول جائے ایک ان میں سے تو یاد دلا دے اس کو وہ دوسری"

(سورۃ بقرۃ آیت ۲۸۳۔ ترجمہ شیخ الہندؒ)

اس آیت کی بنیاد پر اسلامی قانون شہادت میں اصول طے کر دیا گیا ہے کہ ان معاملات کے سوا جہاں مردوں کا گزر نہ ہو سکتا ہو' اکیلے ایک عورت کی گواہی کافی نہیں ہو سکتی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گواہی ایسے معاملے میں بھی اسلام نے عورتوں کو مردوں کے بالمقابل کم قابل بھروسہ سمجھا ہے۔ اگرچہ ایسا نہیں ہے۔ اسی خطرے کے طرف اشارہ کرتے ہوئے مفتی محمد عبدہ نے کہا ہے کہ اس آیت سے عورتوں کی توہین مقصود نہیں ہے۔ بلکہ عورتیں چوں کہ مالی معاملات سے پوری طرح واقف نہیں ہوتیں اور اس کی پیچیدگیوں پر ان کی نظر نہیں ہوتی' اس لیے ان کی سہولت کے پیش نظر ان کی تعداد بڑھا دی گئی ہے۔ (تفسیر المنار' جلد سوم' ص ۱۲۴)

بہرحال یہ بحث قطعاً" غیر متعلق ہے کہ قرآن کے اس حکم سے عورتوں کا درجہ گھٹتا ہے یا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب خود قرآن نے ایک مرد کے بجائے دو عورتوں کی گواہی کی علت صاف صاف بیان کر دی ہے تو کیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اگر کسی زمانے میں یہ علت قاعدہ کلیہ کے طور پر باقی نہ رہے تو اب تک ہم جس مفہوم قرآن کو "نص" کہتے آئے ہیں' اس میں تبدیلی ممکن ہو گی؟ اور اس وقت قانون شہادت میں ضروری ردوبدل کر کے عورتوں اور

مردوں کی تعداد کو برابر کر دیا جائے گا؟ یا اگر کبھی ایسا وقت آ جائے جب کہ ہر ممکن طریقوں سے یہ بات ثابت کی جا سکتے کہ پورے کرہ عالم میں مرد عموما" اپنی ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے عورتوں کے مقابلے میں کم تر درجے کے ہو گئے ہیں اور انھیں تجارتی' قانونی' غرضیکہ ہر میدان میں یاددہانی کی زیادہ ضرورت پڑنے لگی ہے تو اس وقت "ایک مرد اور دو عورتوں" کے بجائے "دو مرد اور ایک عورت" کو نص کا درجہ حاصل ہو جائے گا؟ اس موقع پر اجماع کا مسئلہ بھی اٹھ سکتا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ میں جن امکانی تعبیرات کی طرف اشارے کر رہا ہوں' وہ اجماع امت کے خلاف ہیں۔ آج تک کسی نے بھی قرآن کی ان آیتوں کا یہ مفہوم نہیں بتایا ہے' بلکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر آج تک پورا عالم اسلام میراث اور شہادت کے معاملے میں ایک مرد کو دو عورتوں کے برابر قرار دیتا رہا ہے۔ چوں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میری امت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی' اس لیے موجودہ مفہوم' جو اجماع سے ثابت ہے' صحیح اور درست ہے۔

مجھے بھی اس خیال سے پورا پورا اتفاق ہے کیوں کہ میں یہ نہیں کہتا کہ امت نے کسی غلط مفہوم پر اجماع کیا ہے۔ اس کے بر عکس میں یہ کہہ رہا ہوں کہ حالات کے تحت ابھی تک یہی مفہوم انسانی ذہن کو اپیل کرتا رہا ہے اس لیے اس نے اسے صحیح سمجھ کر قبول کیا ہے اور جب تک حالات کے تحت اس پر اجماع باقی رہے گا' اس وقت تک موجود مفہوم ان آیتوں کا دوسرا مفہوم بھی ہو سکتا ہے' تو اس وقت اس نئے مفہوم کو صحیح اور درست سمجھا جائے گا' کیوں کہ اجماع کے بارے میں یہ بات پہلے سے طے ہو چکی ہے کہ ہر زمانے اور ہر علاقے کا اجماع الگ الگ ہو سکتا ہے۔

میرے اس مضمون سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ میں قانون میراث یا قانون شہادت میں کسی خاص تبدیلی کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ ایسا قطعا"

نہیں ہے۔ اس کے برعکس میں ذہن کی تبدیلی کی بات کر رہا ہوں اور ایک خاص کلامی مسئلہ سے بحث کر رہا ہوں کہ انسان کبھی بھی اللہ تعالے کے علم کا مکمل ادراک نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں قرآن کی کسی آیت کا آخری مفہوم کیا ہے' اس کا علم کسی انسان کو نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے اور اس کی کتاب کو تمام زمان و مکان کے لیے آخری ہدایت تسلیم کرنے کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ہمارا اس بات پر بھی ایمان ہو کہ وحی کے مفہوم کی تعیین میں زمان و مکان کے تقاضوں کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (بہ شکریہ' فکر اسلامی کی تشکیل جدید' مرتبہ ضیاء الحسن فاروقی' دہلی)

ا۔ ابو داؤد اور ترمذی کی ایک روایت کے مطابق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ بن جبل کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجتے وقت ان سے پوچھا کہ جب کوئی مقدمہ تمھارے سامنے پیش ہو گا تو تم فیصلہ کن بنیادوں پر کرو گے؟ حضرت معاذؓ نے جواب دیا کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ اس پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم وسلم نے سوال کیا کہ اگر کتاب اللہ میں واضح ہدایات نہ ملیں تب کیا کرو گے۔ انھوں نے جواب میں کہا' اس صورت میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کو اپنا رہنما بناؤں گا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید سوال کیا کہ اگر اسوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی کوئی چیز نہ ملی تو' یہ سن کر حضرت معاذؓ نے کہا کہ تب میں اپنی عقل پر بھروسہ کروں گا۔ ان جوابات سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش ہوئے اور حضرت معاذؓ کی تعریف کی۔